اردو کا کلاسیکی ادب

# فردوسِ بریں

مصنّفہ

مولانا عبدالحلیم شررؔ لکھنوی

مرتّبہ

ممتازؔ منگلوری

○

مجلسِ ترقیِ ادب ○ لاہور

Scanned with CamScanner

# فردوسِ بریں

شرر کے تاریخی ناولوں کی روایت میں "فردوسِ بریں" ایک نیا اور حیرت انگیز تجربہ ہے۔ اس کے پسِ پشت باطنیہ تحریک کا فروغ اور اس کی تاریخی قوت ہے، اور بالآخر اس قوت کا تاتاریوں کے بھرپور حملے کے ہاتھوں انتشار و اختلال۔ ناول کا فارم ایک طرح کی FANTASY ہے، اور شرر نے ان دونوں عناصر یعنی FANTASY اور تاریخیت HISTORICITY کو بہ خوبی یعنی فن کارانہ طور پر ایک دوسرے کے اندر سمونے کا جتن کیا ہے۔ ناول کے دو مرکزی کردار حسین اور زمرد ہیں؛ جو ایک دوسرے سے ٹوٹ کر محبت کرتے ہیں عنفوانِ شباب کی یہ باہمی کشش اور پروانہ وار محبت ناول کے لیے بنیادی مواد فراہم کرتی ہے۔ زمرد کی غیر معمولی صباحت اور دل کشی اور زمرد اور حسین کی ایک دوسرے کے لیے وفاشعاری اور جذبِ شوق از اول تا آخر برقرار رہتے ہیں اور ان میں کوئی کمی نہیں آنے پاتی۔ جبل طالقان میں پریوں کے غول کے ہاتھوں زمرد کی موت ناول کے شروع ہی میں دکھا دی جاتی ہے، گو اس کی اصلیت کا راز آخر آخر میں کھلتا ہے۔ لیکن بظاہر اس موت کے بعد حسین کو جن جان لیوا مصائب، آزمائشوں اور مہمات سے گزرنا پڑتا ہے، وہ سب ایسی کہانیوں کے عناصرِ ترکیبی تصور کیے جاتے ہیں، جنہیں رومانوں یعنی (ROMANCES) کا نام دیا جاتا ہے۔ ان عناصر کے علاوہ جو اشارے معنی خیز ہیں، ان میں سلسلہ ہائے کوہ، وادیاں، گھنے اور تاریک جنگلات، چشمے، مرغزار، سنہری پل (سنہری، جاہ و حشمت اور کامرانی و مطلب براری کی علامت ہے) تہہ خانے، غار، مقفّل دروازے اور داہنی سمت (جو گوہرِ مراد پانے کی طرف رہنمائی کرتی ہے) شامل ہیں۔ مافوق الفطرت طاقتوں کا عمل دخل FANTASY کے تصور سے جزو لاینفک کے طور پر وابستہ ہے اور اس سے اس حقیقت کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ واقعاتی کائنات کے متوازی اور ماورا، جس کے قوانین جانے بوجھے، متعین اور مانوس ہیں، ایک دوسری

Scanned with CamScanner

منشا کا راز البتہ رفتہ رفتہ اور منزل بہ منزل کھلتا چلا جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ "افشائے راز" کی کارفرمائی مسلسل نظر آتی ہے، جس کے ذریعے بہت سے بتوں کو پاش پاش کیا گیا ہے۔ لیکن اس دنیا کا وجود بھی ہے، جس پر فردوس بریں کا گمان گذرتا ہے۔ ناول میں شروع سے آخر تک ایک طنز یاتی منشا

باب پر پہنچ کر ہی اصل حقیقت کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔ اس سے پہلے تک قاری اسی FANTASY کے طلسم میں اسیر رہتا ہے، جس کا اپنا تار و پود محکم اور خود مکتفی ہے، اور تخیل پر جس کی گرفت مضبوط اور ناقابلِ انکار ہے۔ ناول کی تشکیل اور در و بست میں جو تکنیک استعمال کی گئی ہے، وہ التباسیت یعنی ILLUSIONISM کی تکنیک ہے۔ اسی کے ذریعے فردوسِ بریں کا دلفریب نقش ابھارا گیا ہے۔ یہی ناول کے اہم کرداروں کے محرکاتِ عمل کے لیے کنجی فراہم کرتی ہے، اور اسی سے بالواسطہ طور پر مقصود ان توہمات کو آشکار کرنا ہے، جو فرقہ باطنیہ اور ملاحدہ نے عام ذہنوں میں بٹھا رکھے تھے۔ اس ناول کو داستان گوئی کی روایت پر ایک واضح اضافہ سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہاں کردار بڑی حد تک ایک انسانی سطح اور اپنا تشخص رکھتے ہیں، محض تخیل کے تراشیدہ یا ان کی ممیاں نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں شیخ شریف علی وجودی، جو وادیٔ ایمن کہلاتے ہیں، شیخ الجبب، جو طورِ معنی کے نام سے موسوم ہیں، اور رکن الدین خورشاہ، جو امام قائم قیامت کا لقب اختیار کیے ہوئے ہیں، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کاظم جنونی ہیں، جو ایک طرح کے حاشیہ بردار اور کارپرداز ہیں۔ وادیٔ ایمن، طورِ معنی اور امام قائم قیامت اس گہری سازش میں شریک غالب اور اس کے معمار ہیں، جو عام لوگوں کو ان کے مذہبی معتقدات کی بناء پر گمراہی میں مبتلا کرنے کے لیے بڑی سوجھ بوجھ، اہتمام و انصرام اور ہوش گوش کے ساتھ وضع کی گئی ہے۔

اس ناول میں جو بنیادی رمز استعمال کیے گئے ہیں وہ نور و ظلمت اور جسم و روح ہیں۔ اسی لیے حقیقتِ اعلیٰ کو، جو انسان کے خیال کے نور سے منزہ ہے، نور الانوار کہا گیا ہے۔ شیخ علی وجودی برزخ کہے جاتے ہیں، اس لیے کہ وہ عالم لاہوت اکبر اور ناسوت کے درمیان اپنا وجود رکھتے ہیں۔ 'وادیٔ ایمن' اور 'طورِ معنی' جیسے القاب بھی نور کے اسی رمز سے ملحق ہیں، اور ناول کے غالب موضوع سے اندرونی وابستگیاں INTERCONNEXIONS رکھتے ہیں۔ ان دونوں کرداروں کے بارے میں ایک سے زائد بار کہا گیا ہے کہ وہ دریائے نورِ وحدت و کثرت کے شناور ہیں اور حسین کو بھی۔ یہی



نصیحت کی جاتی ہے کہ 'اغرقنی فی بحار الانوار'۔ اور شیخ الجبب کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

"دن چونکہ مظہر النور ہے، لہٰذا دن بھر وہ اپنے اوپر انوارِ لاہوتِ اکبر کا انعکاس کرتے ہیں، اور رات چونکہ تیرہ و تار اور نمونۂ ظلمت ہے لہٰذا اس ظلمت میں وہ مادی پیکروں سے ایک گونہ علاقہ پیدا کرتے ہیں۔" (ص ۵۷)

دوسرا رمز اشیاء کے ظاہر و باطن کا ہے۔ چنانچہ شیخ وجودی کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:

"موسیٰ اور خضر کا واقعہ ہر وقت پیشِ نظر رکھو اور یقین کر لے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے، نتائج ہمیشہ باطن پر مرتب ہوتے ہیں۔ ظاہر پرست رموزِ فطرت کو نہیں سمجھ سکتے۔" (ص ۴۴)

اور

"جن کاموں کی تعمیل خضر نے کی، اور جن میں موسیٰ سے مدد لی، ان کا باطنی پہلو صرف خضر کے دل میں تھا۔ اور موسیٰ کی نیت میں وہ قطعی معاصی تھے۔ مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ موسیٰ نے گناہ کیا اور اتنے بڑے کبائر میں شریک ہوئے۔" (ص ۴۷)

معمولی نظریں ظاہر کو دیکھتی اور اس سے دھوکہ کھا جاتی ہیں، لیکن وہ لوگ جو واقفِ اسرار ہیں، ظاہر کے باطنی اور اندرونی پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لا سکتے اور انھیں باہم تطبیق دینے پر قادر ہیں۔ اور ظاہر ہر چند ناپسندیدہ، مضرت رساں اور اخلاقی لحاظ سے نامعتبر اور قابلِ اعتراض معلوم ہوتا ہو، تب بھی باطن اس کے برعکس معنویت کا حامل ہو سکتا ہے۔ اور اس سے اس امر پر دلالت کی گئی ہے کہ عالم بھی دو طرح کے ہیں: ظاہری عالم پر قبضہ اور تصرف دنیاوی حاکموں کا ہے، جو سیاسی بازیگری میں طاق، اسباب معلوم و بین پر قادر اور مادی قوت و اقتدار کے حریص ہیں؛ اور اندرونی اور باطنی کائنات پر ان لوگوں کا، جو روح کے محافظ اور امین اور ان دیکھے اور نامعلوم علل و نتائج پر متصرف ہیں۔ جسم و روح دونوں کے اپنے اپنے مطالبات اور اپنی اپنی تخصیصات ہیں۔ لیکن ایک امر فی الواقع قابلِ غور ہے، وہ یہ کہ روح جب تک تاریک مادے یا جسم کی کثافت اور آلودگی سے پوری طرح منزہ نہ ہو جائے اور طہارت اور پاکیزگی حاصل نہ کر لے، وہ مستقل طور پر اور اطمینان کے ساتھ اندرونی اور باطنی کائنات پر متمکن اور اس میں سکونت پذیر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ مادی دنیا کے علائق اور وابستگیاں اسے اپنے میں ملوث رکھیں گی، اور اپنی جانب کھینچتی رہیں گی اور وہ دلجمعی کے ساتھ اسے اپنا مرکز اور مستقر نہیں بنا سکے گی۔

Scanned with CamScanner

ذہنی اور تخلیقی سطح پر ناول کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا حصہ فردوس بریں میں دخول اور نفوذ سے متعلق ہے اور دوسرا اس سے اخراج اور اسے مسترد کر دینے سے، یعنی ناول میں ایک کیفیت یا حالت صعود کی ہے اور دوسری سقوط اور انہدام کی۔ پہلے حصے میں فردوس بریں کا ایک گمراہ کن نقش یا التباس ILLUSION قائم کیا گیا ہے؛ جو دراصل چربہ ہے ان تمام جسمانی اور حسی لذائذ اور دلفریبیوں کا، جو جنت کے روایتی اور مسلمہ کردار سے وابستہ ہیں اور پھر اس نقش کی بے حقیقتی اور اس کی شکست و ریخت کا منظر سامنے لایا گیا ہے۔ یہاں ایک اور امر بھی توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ فردوس بریں میں زمرد سے وصال اور ہم آغوشی (اور زمرد شروع ہی میں کوہ البرز کی گھاٹی سے اترتے ہوئے پریوں کے غول کے ہاتھوں موت سے ہمکنار دکھائی جاچکی ہے) اسی وقت ممکن ہے، جب کہ حسین صبر آزما اور شکیب طلب آزمائشوں اور صعوبتوں کے ایک پورے سلسلے سے گزر چکا ہو۔ ان آزمائشوں میں چلہ کشی، تیرہ و تار غاروں میں تجرد اور تنہائی کی زندگی مباتی قوتِ لاہوت برگزرادقات، مرشد کے سامنے ہمہ تن انقیاد و اطاعت، اس کے احکام کی بے چون و چرا بجا آوری اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر ایسے نیک طینت اور معصوم علمائے دین، جیسے امام نجم الدین نیشاپوری اور امام نصیر بن احمد وغیرہ کا قتل شامل ہیں۔ مراقبے اور مجاہدے جو بالعموم نفس کی تربیت اور تہذیب اور ظلم و سرکشی کے جذبات کو کچلنے کے لیے برتے جاتے ہیں انہی میں وہ عجیب و غریب عبادت بھی شامل ہے، جو چالیس دن تک حضرت یعقوب اور حضرت یوسف کے جنازوں کے درمیان ایک غار میں بیٹھ کر کی گئی ہے۔ ان ریاضتوں کے بارے میں جب حسین ایک منزل پر کنہہ حقیقت تک پہنچنے کے لیے استفسار کرتا ہے کہ اسے ان چکروں میں کیوں ڈالا گیا ہے تو اس کا جواب زمرد کی زبانی یوں دیا گیا ہے:

> "اس لیے کہ تمہارے شوق میں ہیجان اور بے صبری پیدا ہو۔ اگر بغیر اتنے چلے کھنچوائے اور بغیر علی وجودی کے پاس ایک سال انتظار کرائے کہہ دیا جاتا، تو تم اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب پر ہرگز آمادہ نہ ہوتے" (ص ۱۴۶)

متبحر اور معصوم علماء کے قتل کا جواز اخلاقی قوانین سے پہلوتہی اور ان سے اعراض کے اندر تلاش کر لیا جاتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قتل جو بظاہر غیر انسانی اور سفاکانہ ہیں، اور انتہا درجے کی سنگ دلی اور شقی القلبی کی چغلی کھاتے ہیں، ایک باطنی پہلو بھی رکھتے ہیں، جس کا ظاہر بین نظروں سے، جو محدود صلاحیت



رکھتی ہیں، مخفی رہنا ہی قرینِ مصلحت و انصاف ہے۔ جن دشوار گذار راستوں کو حسین کو عبور کرنا پڑتا ہے، جن خطروں میں جان کھپا کر وہ مختلف پراسرار اور مہیب مقامات تک پہنچتا ہے۔ اور جن جن دشمنوں سے، جو اس کی گھات میں لگے رہتے ہیں، بچتا بچاتا وہ اپنی منزلِ مقصود تک پہنچتا ہے؛ وہ سب اس کڑی آزمائش کا لازمی جزو ہیں۔ اسے یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مرشد کی نسبت سے مرید ایک محض ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ "مرید مرشد کے ہاتھوں میں صرف ایک بے جان اور غیر ذمے دار آلے کی حیثیت رکھتا ہے" (ص۔ ۵۱) اور اس لیے اسے اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی ایسے فعل کی افادیت اور معنویت پر، جسے مرشد نے اس کے لیے لازمی قرار دیا ہو، شبہ کرے یا اس پر نکتہ چینی روا رکھے۔ بلکہ اس کے برعکس وہ اس پر آمَنّا وصَدَّقنا کہے۔ شیخ کا امر اس کے لیے واجب الاذعان اس لیے ہے، کیونکہ مرید اشیاء کے صرف ظاہری اور خارجی پہلوؤں کا احاطہ کر سکتا ہے، جب کہ مرشد ان کے قلب میں اترنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اور ان کی ماہیت سے آگاہی رکھتا ہے۔ مزید برآں نتائج مرید کے اعمال پر نہیں، بلکہ مرشد کی نیت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اور اس لیے وہ اپنے جن اعمال کو معاصی تصور کرتا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ اس ضمن میں نہ آتے ہوں۔ بہر حال مرید کو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ ان اعمال کو کسی طرح بھی معرضِ بحث میں لائے، جو مرشد نے اس کے لیے مقرر کر دیئے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی کہا گیا ہے کہ فردوسِ بریں میں داخلے کی شرطِ اولیں اور لابدی مادے کی کثافت سے جسم کا تطہیر حاصل کر لینا ہے۔ جس قدر جسم یہ تطہیر حاصل کرے گا، اسی نسبت سے وہ اس کائنات میں رسائی پا سکے گا، جو مادے کے گرد و غبار اور آلائش سے پاک صاف ہے۔ تطہیر کا یہ عمل منحصر ہے روحانی ضابطوں اور پروگرام کے پورا کرنے پر اور ایک حد تک مرشد کے نگہِ فیض اثر پر۔ اور یہ نگہ ایسی ہے جو عقل و حواس کو فی الوقت اور عارضی طور پر معطل کر دیتی ہے اور انسان مرشد ہی کی آنکھوں سے ہر شے کو دیکھنے لگتا اور اسی کے کانوں سے ہر آواز کو سننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے کاظم جنونی کے الفاظ میں یہ یقین بھی دلایا جاتا ہے کہ "شجرِ معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔" یا بہ الفاظِ دیگر اور ناول کے مخصوص محاورے کے مطابق وہ نورِ ایزدی کا ایک پرتو ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا نامناسب نہ ہوگا، کہ یہ ٹکڑا مختلف سیاق و سباق میں کاظم جنونی اتنی بار دہراتا ہے، کہ ایسا لگتا ہے، کہ یہ کوئی وظیفہ یا منتر ہے سادہ دل لوگوں کو اس مخفی اور پراسرار جماعت کے رکن بنانے کا۔ اور خود کاظم جنونی کی حیثیت ایک اداکار کی

سی ہے، جو اس وظیفے کا برابر ورد کرتا رہتا ہے اور اسی سے اس کی شخصیت کا رنگ روپ متعین ہوتا ہے۔

شروع میں کہا گیا تھا کہ ناول کے عمل کا پہلا حصہ متعلق ہے، فردوس بریں میں داخلے اور اس کی طرف صعود سے۔ اس کی جانب حسین کو ان خطوط کے ذریعے ترغیب دلائی جاتی ہے، جو زمرد کی قبر پر، کوہ البرز کی گھاٹی میں ایک جادوانی طریقے سے رکھ دیے جاتے ہیں۔ ان کی حیثیت ان حیرت زا اور موثر تحریروں کی سی ہے، جو FANTASY کے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ یہ ہمارے احساسِ تحیر کو اکساتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے ناول کے ہر مرحلے پر ہم ایک نامعلوم لیکن پُرشوق امید اور جستجو کے سہارے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ ان خطوط میں اسے ہدایت دی جاتی ہے، مخصوص سمتوں سے غاروں، گھاٹیوں اور تہ خانوں میں داخل ہونے اور ان سے سلامتی کے ساتھ گزر کر مخصوص مقامات تک پہنچنے کی اور پھر شیخ علی وجودی اور شیخ المجیب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے کارناموں کی تفصیل بیان کرنے کی۔ حسین اپنی وفا کیشی اور حسنِ خدمت کا صلہ صرف اس صورت میں طلب کرتا ہے کہ زمرد سے اس کی ملاقات ملاءِ اعلیٰ میں کرادی جائے۔ یہ ملاقات اس زمرد سے ہے جو بظاہر فردوس بریں میں مقیم اور متوطن ہے، اور جس کے اور حسین کے درمیان بعدِ مکانی حائل ہے۔ ناول کے پہلے حصے میں حسین گوہرِ مراد کو پالیتا ہے۔ یعنی زمرد سے اس کی ملاقات ایک امرِ واقعہ بن جاتی ہے۔ مگر ان روحانی ریاکاروں کے توسط اور وسیلے سے صرف ایک ہی بار۔ یہ ملاقات ہے ایسی روح سے جو کثافتِ مادی سے صرف ایک ہی حد تک چھٹکارا پاچکی ہے، اس حسین کی جو جسدِ خاکی کے مقتضیات میں ہنوز اسیر ہے۔ گو ایک حد تک وہ مجاہدے اور مجادلۂ نفس کے عمل سے گزر چکا ہے۔ اس ملاقات کی مدت اس درجے قلیل اور محدود ہے کہ اس سے تشنگیٔ طلب کی پوری طرح سیرابی نہیں ہونے پاتی، بلکہ اس سے بے تابی میں کچھ اضافہ ہی ہو جاتا ہے۔ ابھی حسین کو مزید طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنا ہے اور اس لیے اس محدود قیام کی مدت ختم ہوتے ہی اسے فردوسِ بریں سے اخراج اور مادی دنیا کی طرف مراجعت کا حکم دیا جاتا ہے۔ جسے وہ طوعاً و کرہاً قبول کرنے پر مجبور نظر آتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کرنا شاید غیر ضروری نہ سمجھا جائے کہ یہ ملاقات بھی اسی التباسیت یعنی ILLUSIONISM کا ایک جزو ہے، جس کا شروع میں ذکر کیا گیا۔

شیخ علی وجودی کا کردار اس ناول میں نہایت درجے وقیع اور اہم ہے، زمرد کی ہدایت کے بموجب حسین اس سے شہر حلب کی مسجد الشامتین میں ملاقات کرتا ہے۔ اس کا تعارف وہ اپنے خط میں اس طرح



کراتی ہے:

"اس عالمِ عناصر میں اس کا نام شیخ علی وجودی ہے۔ یہ شخص اگرچہ بالکل منکسر المزاج اور سادہ وضع نظر آئے گا مگر اس کی آنکھوں سے ریاضت و نفس کشی اور جذباتِ روحانی زیادہ ہونے کی وجہ سے شعلے نکلتے ہوں گے۔" (ص ۲۵)

اس تعریف کا صرف دوسرا ٹکڑا صحیح اور درست ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ علی وجودی نہ صرف اس پوری سازش میں بحدِ کمال فعال ہے، جو عام لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے کی گئی ہے، بلکہ وہ اپنی روحانی پختگی اور کشف والہام کی صلاحیتوں کا بھرپور التباس پیدا کرنے میں بھی یدِ طولیٰ رکھتا ہے؛ اور اپنے نقطۂ نظر اور راہِ عمل پر کسی تنقید کو ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔ بلکہ ایسے ہر موقع پر اپنے روحانی جلال کا مظاہرہ کر کے مخالف یا ناقد کا منہ بند کردینے کے ہنر سے بھی بخوبی واقف ہے۔ اس جلال کی بیرونی نشانیاں ہیں، غیظ و غضب، سرکہ جبینی اور آتش نوائی، اور اشتعال کے باعث کف کا منہ سے باہر آجانا۔ اس کے کردار کا سب سے نمایاں پہلو نخوت اور تکبر اور اپنے بارے میں حد سے زیادہ تیقن اور اعتماد کا ہے۔ چنانچہ حسین سے ایک مکالمے کے دوران جب وہ یہ کہتا ہے:

"اے بحرِ وجود اور دریائے وحدت کے ذلیل و ناپاک قطرے، تیرا کیا حوصلہ ہے کہ اس وجودِ غیر موجود اور لاہوتِ غیر متنوع کے رموز کو سمجھ سکے۔" (ص ۳۳)

تو در پردہ یہ اعلان ہے اپنے روحانی اکتسابات و تصرفات پر تفاخرِ بے جا کا، اور اس سے حسین کے لیے جو تحقیر ظاہر ہو رہی ہے وہ اس منکسر المزاجی اور سادہ طبعی سے بمراحل دور ہے، اور اس کی سراسر تکذیب کرتی ہے، جو اس سے منسوب کی گئی ہے۔ البتہ اس کی شخصیت میں ایک کہربائی قوت، ایک مقناطیسی کشش اور ایک اثر پذیر حالت یعنی MESMERISM کی کیفیت پائی جاتی ہے، جس کی شعوری طور پر تربیت کی گئی ہے، اور جس سے انکار ممکن نہیں، اسی بنا پر غالباً حسین اس اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے:

"ان کا علم و فضل اس پائے کا ہے کہ ان کے ہر ہر لفظ سے ایسی خداشناسی اور آشنائے رموزِ وحدت ہونے کی بو آتی ہے، کہ چاہتا ہوں، مگر ان پر بدگمانی کرنے کی جرات نہیں ہوتی .... جو بات مجھے شیخ علی وجودی میں نظر آئی، اور جس آسانی سے وہ

تھا" (ص ۱۵۰)

دل کے شکوک رفع کر دیتے ہیں، امام نجم الدین میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ

ناول میں شیخ علی وجودی کا سرد کار بیشتر دو امور سے ہے: اول مرید کو ایک آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا، اور کسی بھی اخلاقی بدعنوانی کے خلاف اس کے احتجاج کو یہ کہہ کر دبا دینا کہ مرید کی نظریں اشیاء کے باطنی پہلوؤں کو اپنی گرفت میں نہیں لا سکتیں، اور اسی لیے حسن و قبح کے مابین نازک امتیازات کو متعین نہیں کر سکتیں۔ اور دوسرے یہ کہ جزا و سزا کا مورد مرشد کی نیت ہے، مرید کے اعمالِ ظاہری نہیں۔

دوسرا اہم موضوع یا محرک جسم اور روح کا مادی زندگی کے تناظر میں ایک دوسرے سے ربط باہمی ہے۔ اور اس لیے وہ کہتے ہیں کہ یہ محدود زمانہ جسے عام طور سے زندگی کہا جاتا ہے، دراصل روحوں کے کمال حاصل کرنے کا مدرسہ ہے۔ یہ اکتسابِ کمال و پختگی ایک دو گونہ عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اول یہ کہ روح جسم کے علائق کی پابند ہو کر لذت و الم کا اس حد تک تجربہ حاصل کرلے کہ وہ جب چاہے اپنے آپ کو متحیر و متشکل کر سکے، اور دوسرے اس میں یہ صلاحیت ہو پالے کہ وہ حسب دل خواہ ان وابستگیوں سے علیحدہ ہو کر سرچشمۂ نورِ ازلی سے تعلق پیدا کر سکے۔ چنانچہ شیخ علی وجودی کی زبان سے کہا گیا ہے کہ روح کے اکتسابِ کمال کا تیسرا اور آخری مرحلہ یہ ہے:

> "اب اس کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک طرف تعلقاتِ جسدی کی مادی تعلیمات سے اس میں یہ
> صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جب چاہے اس عالم کے سامنے اپنے آپ کو متخیل یا متشکل
> ہو کے دکھا دے، اور دوسری طرف اس میں کمالِ روحانیت و تجرد اس درجے کا ہو کہ جب
> چاہے اس نقطۂ ازلی اور اعلیٰ مرکزِ نور الانوار سے جا ملے۔" (ص ۵۴)۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، اگر ہم اس سلسلے میں انتہائی وقیع اس قیاس کو سامنے رکھیں، جسے انگریزی رومانی شاعر کیٹس نے اپریل ۱۸۱۹ء کے اپنے ایک خط میں بایں طور ظاہر کیا ہے: "گو عرفِ عام (COMMON COGNOMEN) میں دنیا یا زندگی کو آنسوؤں کی وادی کہا جاتا ہے، لیکن دراصل یہ روح کی تعمیر کا عرصہ ہے، وہ روح جو INTELLIGENCES سے مختلف ہے، یہ INTELLIGENCES کیا ہیں؟ یہ اس الوہیت کی چنگاریاں ہیں جن میں انسان شریک و سہیم تو بے شک ہے، لیکن اسے انفرادیت یا خودی یا تشخص (IDENTITY) اسی وقت دیا جا سکتا ہے، یا اسے روح میں جب ہی متبدل کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس پر فواد یا قلب کا عمل واقع ہو۔ اور یہ مکانی



یا وا اقعاتی کائنات کی حدود میں رہ کر ہی ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دیگر INTELLIGENCE خدا کے جوہر کا ایک حصہ ہے اور اسے روح بننے کے لیے نفس سے بڑھ کر IDENTITY کی ضرورت ہے، اسے آپ روحِ لطیف بھی کہہ سکتے ہیں، جسے حاصل کرنے کے لیے فواد اور مکانِ آب و گِل کا تعلق اور توسط ضروری ہے۔ کیٹس نے آگے چل کر روح کو ایک بچے سے تشبیہ دی ہے، فواد کو HORN BOOK سے، اور دنیا یا زندگی کو مدرسے سے۔ قلب ایک ضروری معمول یا MEDIUM ہے۔ 'مدرسے' کی اصطلاح کیٹس اور شرر دونوں کے ہاں مشترک ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ شرر نے شیخ علی وجودی کی زبان سے یہ فلسفہ طرازی کر کے اس کی اپنی مکاری کو ایک طنزیاتی شکل دے دی ہے۔ جب کہ کیٹس سنجیدگی کے ساتھ نفس اور غیر نفس کے باہمی تعامل پر اظہارِ رائے کر رہا ہے۔ اس نے INTELLIGENCE اور روحِ لطیف کے درمیان ایک بنیادی فرق کی نشان دہی کی ہے۔ اور قلبِ انسانی اور مادی احوال کو ایک معروض کے طور پر برتنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شیخ علی وجودی کا مقصد محض یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس نے اپنے مجاہدے اور عملِ استغراق کی بدولت یہ مہارت حاصل کرلی ہے کہ وہ جسم و روح دونوں کی دنیاؤں میں بیک وقت اور نہایت سہولت کے ساتھ جادہ پیمائی کر سکتا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا برمحل معلوم ہوتا ہے، کہ شیخ علی وجودی کی یہ طویل گفتگو اور اس کا یہ تفلسف، کیٹس کے تعمیرِ روح (SOUL CREATION) کے عمل کی ایک بھونڈی اور مضحک نقل معلوم ہوتا ہے۔

'فردوسِ بریں' کی نقش گری میں شرر نے جزئیات نگاری سے کام لے کر اور اپنے تخیل کی قوت پر بھروسہ کر کے اس اصل کا ہو بہو چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے، جو عام معتقدات کا ایک حصہ ہے۔ یعنی جس پر انسان مدتوں سے یقین کرتا چلا آیا ہے۔ یہاں تمام تر زور حسی لذات پر ہے" اور اس لیے براہ راست تجربے پر: چمن بندی، نہریں، فوارے، پھولوں کے دیدہ زیب تختے، سبزۂ نودمیدہ کی چادریں، روشنی کا موج در موج سیلاب، موتیوں اور جواہرات سے مرصع اور مزین قالین، تخت اور گاؤ تکیے، حور و غلمان، جو حسین اور خوب رو، توبہ شکن اور خرد سوز ہیں، پھل اور میوے، طیور نغمہ سنج، اور شرابِ طہور کے جام اور انھیں پیش کرنے والی نازنینانِ سمن بر، غرض یہاں پر ہر وہ چیز فراہم کر دی گئی ہے، جو حواس کو آسودگی بخشتی، کام و دہن کو سیراب کرتی اور حقیقی جنت کا التباس

نام کرتی ہے۔ اس کا اولین نقش اس طرح سامنے لایا گیا ہے:

"کوہستان اور دربندوں کے مسکن کے نیچے ایک نہایت ہی وسیع، عالی شان اور بارونق مکان نظر آیا، جس میں ہر طرف کافوری شمعیں تھیں۔ عود لوبان سلگ رہا تھا اور دیوار پر طلائی رنگ پھر کے نقش اور شیشے کے ٹکڑے جڑے تھے جس پر شمعوں کا عکس پڑ کے ایک عجیب عالم پیدا کر رہا تھا۔ حسین اس تمام سامانِ عیش کو دیکھ کر مبہوت و خود رفتہ ہو گیا اور ایک بے صبری کے جوش میں چلا اٹھا کیا فردوس بریں یہی ہے؟" (ص ۵۱)

دوسرا اور اس سے زیادہ بھرپور اور تیکھا نقش اس طرح ابھارا گیا ہے:

"وہاں جا کے دیکھا تو اور حیرت ہوئی۔ پانی کے پاس ہی سبزے کا ایک پتلا اور برابر حاشیہ چھوڑ کے شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے، جو نہر کے دونوں جانب برنظر بستہ چلے گئے ہیں۔۔۔۔ سارا مرغزار اور ساری وادی جو کوسوں تک پھیلی ہوئی ہے، اور جسے خوبصورت، سبزوادی اور سرسبز و شاداب پہاڑوں نے اپنے حلقے میں کر لیا ہے۔ از سرتاپا ان چمنوں اور پھولوں سے بھری ہوئی ہے؛ اور مختلف نہریں جو آبشاروں کی شان سے اور پانی کی چادریں بن بن کے پہاڑوں سے اتری ہوئی ہیں۔ ان ہی چمنوں اور نہروں کے درمیان جابجا بہہ رہی ہیں۔۔۔۔ یہ نہریں زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہیں کہ ہم ہی تسنیم و سلسبیل ہیں۔۔۔۔ ان ہی چمنوں میں جابجا نہروں کے کنارے سونے چاندی کے تخت بچھے ہیں، جن پر ریشمی پھول دار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ پرتکلف گاؤ تکیوں سے پیٹھ لگائے دل فریب اور ہوش ربا کم سن لڑکوں کو پہلو میں لیے بیٹھے ہیں، اور جنت کی بے فکریوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ خوبصورت، کفتِ روزگار لڑکے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں، اور کہیں نہایت ہی دل فریب حرکتوں سے ساقی گری کرتے ہیں۔" (ص ص: ۶۶-۶۵)

سب سے زیادہ دل چسپ امر یہ ہے کہ اس مصنوعی جنت میں وقت کے مختلف حصوں کا بھی التباس پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے:

"تھوڑی دیر کے بعد دونوں (حسین اور زمرد) ایک ایسے درختوں سے گھرے ہوئے سبزہ زار میں پہنچے جہاں آفتاب کی روشنی کو درخت روکے ہوئے تھے۔ ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، اور مشرقی



قلہ ہائے کوہ سے ایک ہلکی ہلکی روشنی نمودار تھی۔ زمرد یہاں پہنچ کے بولی: "دیکھو یہ صبح کا وقت ہے۔" (ص ۷۳)

اس کے بعد:

"یہاں سے روانہ ہو گئے، تھوڑی دیر میں دونوں ایک چھوٹی سی وادی میں پہنچے، جو ہر طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھی درختوں نے خفیف تاریکی پیدا کر دی تھی، اور ذرا فاصلے کے مقامات پر ہلکا دھواں اٹھتا نظر آتا تھا، کہیں کہیں چراغ جلنے لگے تھے۔ طیور کے چہچہانے کا شور بلند تھا اور مغرب کے قلعے پر آفتاب کے غروب ہونے کی بھی شعاعیں نظر آ رہی تھیں۔ زمرد نے یہاں رک کر کہا، اور یہ شام ہوئی۔" (ص ۷۷)

اور پھر آخر آخر میں:

"اس زمین دوز راستے میں جاتے جاتے دونوں ایک نہایت عالی شان اور پرتکلف قصر میں پہنچے؛ جس میں ہر طرف کافوری شمعیں روشن تھیں۔ جھاڑ اور فانوس کثرت سے لٹک رہے تھے، اور در و دیوار میں شیشے کے رنگ برنگے ٹکڑوں کو شمعوں کی شعاعیں کچھ ایسی عجیب و غریب روشنی سے چمکا رہی تھیں کہ نظر خیرہ ہو جاتی تھی۔ دیکھو یہ رات ہے اور کیسی پیاری رات۔" (ص ص ۸۳-۸۴)

یہاں بظاہر صرف فطری ماحول کی تبدیلی سے وقت کے بدلنے کا تاثر ابھارا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت ایسا لگتا ہے کہ ہم کسی ایسی جگہ پر ہیں، جس میں شش جہت آئینہ بندی کی گئی ہے اور تیز و ہلکی روشنیوں کے ذریعے جنہیں بڑی مہارت سے گردش دی جاتی ہے، نظامِ اوقات کا تعین کیا گیا ہے اور ان کی سلسلے واری (SEQUENCE) کو تشکیل کیا گیا ہے۔ کم و بیش یہی شے ہمیں اس تراشے میں ملتی ہے، جس میں حسین اپنی نفسی حالتوں کی تبدیلی کو بصورت خواب ارد گرد کی فضا کے آئینے میں، جو برابر جنبش میں رہتی اور اپنا مستقر بدلتی رہتی ہے دیکھتا ہے:

"اس غفلت اور خود رفتگی کی نیند میں کئی مرتبہ اس کی آنکھ کھلی، وہ ہر مرتبہ اپنے آپ کو ایک نئے مقام میں پاتا تھا۔ کبھی سرسبز و شاداب زمین میں ہوتا، اور کبھی وحشت ناک اور پرخطر گھاٹیوں میں۔ ہر جگہ [illegible] فرشتے یا انسان، مگر کسی غیر معمولی قسم کے لوگ اسے سرگزشتاں سے اور زیادہ قریب ہونے کا یقین دلاتے، اور وہ یقین کر لیتا۔" (ص ۶)

اقتباس ماقبل سے یہ اس لحاظ سے ذرا مختلف ہے، کہ اس میں ایک طرح کے خواب کی پیکر نگاری (DREAN IMAGERY) استعمال کی گئی ہے۔ مگر ایک نوع کا گردش کرتا ہوا منظر (SHIFTING LAND-SCAPE) ان سب اقتباسات میں ایک مشترک عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس میں ایک طرح کی بناوٹ (ART-IFICE) کو خاصا دخل ہے۔ مگر اس اقتباس کے باوصف، جو بڑی کامیابی کے ساتھ ابھارا گیا ہے، قاری یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا، کہ یہ فردوس بریں یہیں کہیں روئے زمین کے کسی چپے یا گوشے پر موجود ہے! جیسا کہ ناول کے آخری حصے میں زمرد کی زبان سے کہلوایا گیا ہے:

"یہ باتیں کرتے کرتے شہر میں داخل ہوئے اور زمرد نے کہا: یہاں کی سرزمین تو بے شک دنیا کی عام سرزمینوں سے بالا تر ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ تم دنیا سے نکل کے کسی اور جگہ آ گئے ہو" (ص ۱۴۱)۔

حسین اس فریب میں اس لیے گرفتار ہو جاتا ہے کیونکہ جام شراب طہور سے سرشاری اس کے حواس کو کچھ دیر کے لیے معطل کر دیتی ہے اور اسے وہم پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ زمرد اور حسین ایک ہی طلسم میں اسیر ہیں۔ گو ان کے جذبہ تاثر کی کیفیتیں کسی قدر مختلف ہیں۔ یہ کیفیت کچھ عرصے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اور حسین پھر اسی عالم آب و گل کی طرف لوٹ آتا ہے، بلکہ سچ پوچھیے تو اس میں شک کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس سے نکلا ہی کب تھا؛ اس پر جو حالت گزری، وہ ایک طرح کے سحر کے مرادف تھی۔ وہ جذبات کے زیر و بم میں ہچکولے کھاتا رہتا ہے۔ اس سے اس کی تشنگی اور بے تابی اور بڑھ جاتی ہے زمرد سے وصال کی خواہش اسے ہر لمحہ آتش زیر پا رکھتی ہے، اور اس کی لمحاتی تکمیل ہی اسے اس طلسم سے بالآخر نجات دلاتی ہے۔

اس ڈرامے کا دوسرا نقطۂ عروج رکن الدین خورشاہ کے دربار کا منظر ہے۔ حسین جب فردوس بریں کی لذتوں سے کچھ عرصے سرشار رہ چکنے کے بعد اس سرزمین کی طرف واپس بھیج دیا جاتا ہے، جہاں سے اس نے اپنے سفر کا آغاز کیا تھا، تو اس کے دل میں زمرد سے بازدید اور وصال کی حسرت اور تمنا پھر چٹکیاں لینے لگتی ہے۔ اس مرتبہ اسے شیخ علی وجودی کا خط لے کر خورشاہ کے پاس آنا پڑتا ہے کہ اسی کے حکم اور توسط سے وہ ایک بار پھر فردوس بریں میں داخل ہو سکتا ہے۔ خورشاہ اس ناول کا وہ کردار ہے، جس کا نقش ذہن پر نہ خوشگوار پڑتا ہے، اور نہ گہرا۔ بالواسطہ طور پر اس کا تعارف اس طرح کرایا جاتا ہے:

"وہی خط جو شیخ علی وجودی نے لکھ کر دیا تھا، اسے لے کر قلعہ دار کے پاس بھیجا گیا۔ پھر رکن الدین



خورشاہ کے ملاحظے میں پیش ہوا۔ جو ان دنوں تمام باطنیین کا امام اور علی ذکرہ السلام کا پوتا تھا۔ خورشاہ کا ہنوز عنفوان شباب تھا، مگر چونکہ ان لوگوں کے عقیدے میں امام پیدا ہوتے ہی امام ہوتا ہے، لہٰذا ان کے تقدس اور وجاہت میں نوعمری سے کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔۔۔ جو لوگ بادشاہ امام کے احکام بے عذر و بے حجت آنکھیں بند کر کے بجا لاتے ہیں، اور جن کے خنجر سے سارا زمانہ کانپ رہا ہے، فدائی کہلاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت ہے کہ مقتدر اور فرماں روا کے حکم پر جان دیتے ہیں، اور خودکشی کو بھی ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ انہی فدائیوں کی وجہ سے جو رعب و داب رکن الدین خورشاہ کے دربار میں ہے، شاید اس عہد کے کسی بادشاہ کے سامنے بے ادبی و مخالفت کا خیال بھی دل میں نہ لا سکے۔" (ص ص ۱۰۲-۱۰۳)

حسین کے بارے میں یہ تاثر غالباً صحیح ہے کہ اس میں بڑی حد تک ایک طرح کی سادگی بلکہ سادہ لوحی پائی جاتی ہے۔ زمرد کے لیے اس کی محبت جنوں انگیز ہے اور وہ ہر قیمت پر اور ہر لمحہ اس سے تجدید ملاقات کے لیے نہ صرف آمادہ بلکہ بے قرار رہتا ہے۔ زمرد اس کی نسبت شاید نتائج و عواقب پر زیادہ نظر رکھنے والی ہے۔ اور اس میں وہ سیمابیت نہیں ہے، جو حسین کے کردار میں اس درجہ نمایاں ہے۔ اس میں پیش قدمی کی صلاحیت اور ذہنی چوکنا پن بھی زیادہ ہے۔ اور اس کا دل ان دیکھے اور اوائلی احساسات خوف PRIMITIVE FEARS کی آماجگاہ بھی نہیں ہے، جو حسین کو ہر وقت گھیرے رہتے ہیں۔ شروع میں حسین کا ضمیر بھی بیدار اور حساس نظر آتا ہے۔ چنانچہ اپنے استاذ اور مربی امام نجم الدین نیشاپوری کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگین کرنے کے بعد جب وہ اس واقعہ کی اطلاع دینے کے لیے شیخ علی وجودی تک پہنچنے کا قصد کرتا ہے، تو اس کے دل میں جو خیالات گزرتے ہیں، انھیں اس طرح ظاہر کیا گیا ہے:

"دوسرے دن جب وہ شوق کے پروں سے اڑتا ہوا خراسان کے مغربی میدان اور جنگل قطع کرتا چلا جاتا تھا، اس وقت اس کے حواس ذرا ٹھکانے ہوئے، اور اپنا ظلم و گناہ یاد آیا۔ جو ہر پہلو سے برا نظر آتا تھا۔ اس خیال کو ٹالنے کی برابر کوشش کرتا تھا، مگر بار بار زبان سے ایک آہ کے ساتھ یہ جملہ نکل ہی جاتا تھا" کہ میں بڑا گنہگار ہوں"! اس کا دل اور اس کا ایمان اس پر لعنت کرتا رہا۔ لعنت اور پھٹکار کی آواز کان میں آتی تھی! اور وہ چونک چونک کے کہتا" اس

Scanned with CamScanner

فعل کے ذمہ دار شیخ علی وجودی ہیں: مگر خود ہی دل میں قائل ہو جاتا، کہ امام کا کام تو میرے ساتھ
اور بہری سنگ دلی نے تمام کیا ہے۔ ذمہ داری کسی اور کے سر کیوں کر جا سکتی ہے۔" (ص ۵۱)

لیکن دوسرا یعنی امام نصر بن احمد کا قتل کر چکنے کے بعد جب حسین خورشاہ کے دربار میں وارد ہوتا ہے، تو اس وقت ضمیر کے یہ کچوکے ختم ہو چکے ہیں؛ اور وہ ان دونوں کے قتل کی قیمت اس سے طلب کرتا ہے اور درشتی کے ساتھ طلب کرتا ہے۔ جسے ایک گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے اور چنانچہ اسے دربار سے نکال دیے جانے کے احکام صادر کیے جاتے ہیں۔ گو اس کے ساتھ یہ رعایت روا رکھی جاتی ہے کہ اس کی جان بخش دی جاتی ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ خورشاہ کا جاہ و جلال اور پندار و نخوت، شیخ علی وجودی کے غیظ و غضب اور تکبر و خود افرازی کا ایک دوسرا رُخ ہے، اور یہ دونوں ایک دوسرے کا تکملہ کرتے اور ایک دوسرے کا جواب پیش کرتے ہیں۔ حسین کے گستاخانہ ردِ عمل کی ایک صریح وجہ یہ ہے کہ ایک فدائی دیدار ہے، جو چغتائی خان کو قتل کر کے لوٹا ہے اور سرِ دربار اپنے کارنامے کی تشہیر کر رہا ہے، انعام کے طور پر فردوس بریں کی سیر کرانے کا وعدہ کر لیا جاتا ہے، جب کہ حسین کو جو دو دو اماموں کو قتل کر چکا ہے، اس کی محبوبہ معشوقہ زمرد سے باز دید کے سلسلے میں کوئی امید نہیں دلائی جاتی۔ حسین میں اب متنوع تجربات زندگی نے ایک طرح کی بے باکی اور دریدہ دہنی پیدا کر دی ہے اور وہ اس کھلم کھلا ناانصافی کے خلاف دھڑلے سے احتجاج کی آواز بلند کرنے سے نہیں ہچکچاتا، اور اس سے خورشاہ کے اندر اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ خورشاہ کے دربار سے حسین کا اخراج ناول کا نقطۂ انحراف ہے۔ اور اس کے بعد جو واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں، ان میں بلغان خاتون کا کردار ایک خاص اہمیت کا حامل بن جاتا ہے۔ بلغان خاتون چغتائی خاں کی بیٹی اور منقو خاں کی بہن ہے۔ اور ان سب کا تعلق ہلاکو خاں سے ہے۔ اس زمانے کے سیاق و سباق میں جس میں یہ ناول پیوست ہے، تاتاریوں کا دبدبہ پوری دنیا پر چھایا ہوا تھا اور یہ ٹڈی دل جس طرف کا بھی رُخ کرتے، ہر شے کو تہہ و بالا کر دیتے اور بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکتے تھے۔ زمرد کا ایک اور خط حسین کی معرفت بلغان خاتون کو بھی اسی پراسرار طریقے سے بھجوایا جاتا ہے، جس طرح اس سے پہلے حسین کو بھجوایا گیا تھا، جیسا کہ ابھی کہا گیا، چغتائی خاں کو ایک فدائی اور باطنی کے ہاتھوں، جس کا نام دیدار ہے، اسی بے رحمی اور سفاکی سے قتل کرایا جاتا ہے، جیسا کہ امام نجم الدین نیشاپوری اور امام نصر بن احمد کو حسین کے معصوم ہاتھوں اس جرم میں قتل کرایا گیا تھا کہ وہ باطنیہ فرقے کے خلاف زور و شور



سے وعظ کہہ کر لوگوں کے سامنے ان کے فریب کا پردہ چاک کر رہے تھے۔ اس انتقام کی آگ، جو بلغان خاتون کے دل میں اپنے باپ کے ناگہانی قتل کے خلاف بھڑک اٹھتی ہے، بالآخر وہ وسیلہ ثابت ہوتی ہے، جس سے باطنی فرقے کا قلع قمع عمل میں لایا جاتا ہے، اور اس کے نتیجے کے طور پر فردوس بریں کے طلسم کا شیرازہ یکسر بکھر جاتا ہے۔ بلغان خاتون، اگرچہ ایک جلوۂ گذراں ثابت ہوتی اور دیر تک نظروں کے سامنے نہیں رہتی، لیکن وہ اپنے حسن و جمال، توازن اور زیرکی، وقار اور خوش سلیقگی کا ایک گہرا تاثر پڑھنے والے کے ذہن پر چھوڑ جاتی ہے۔ اس میں ایک ایسی مہذب دلربائی، ایسی آن بان اور رکھ رکھاؤ، ایسی خود منضبطی اور بردباری ہے، جو اس کردار کو چشم زدن میں بھرپور اور توانا بنا دیتی ہے۔ اپنے بھائی منقو خاں سے اس کا مکالمہ، حسین اور زمرد سے اس کی یگانگت اور ان کے سامنے اس کی نوٹے دل نوازی اور اپنے ہمراہی شہسواروں کے ساتھ اس کا تلطف اسے ہر دل عزیز بنانے کے لیے کافی ہیں۔ وہ مٹھی بھر دستے کو لے کر قلعہ التموت کا رخ کرتی ہے، اور تاتاری فوجیں جو اپنے مرکز اور پایۂ تخت قراقرم سے منقو خاں کی سرکردگی میں مزید کمک کے طور پر پہنچ جاتی ہیں؛ اس قلعے پر حملہ آور ہوتی ہیں، جو رکن الدین خورشاہ کے قبضۂ قدرت میں تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ 'فردوس بریں'، جو اسی قلعے سے ملحق ہے، دراصل اسی کی صناعی، فریب کاری اور بیکیہ آفرینی کا ایک نادر اور جیتا جاگتا شاہکار ہے۔ اس طرح دین و سیاست کی سطح پر رکن الدین خورشاہ اور روحانی سطح پر شیخ الجبل اور شیخ علی وجودی اس ریاکاری اور ابلہ فریبی کے لیے بڑے موثر معمول ہیں، جس کا دائرۂ اثر ڈیڑھ سو سال کی طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ حکومت و سیاست اور دین و اخلاق کے ان نام نہاد اور خدائی ٹھیکیداروں نے مل جل کر حرص و ہوا اور مکر و فریب کا ایک بڑا دور رس اور سخت گیر جال تیار کیا تھا، جس میں اسلامی دنیا کے لاکھوں کروڑوں سادہ اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو مستقل طور پر پھنسانے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ چنانچہ شیخ علی وجودی اور شیخ الجبل کے بارے میں بجا طور پر کہا گیا ہے:

> "ان دونوں نے اپنی گہری سازشوں سے صدہا امرا و وزرا اور علما و فضلا قتل کر ڈالے، اور چونکہ اس جنت اور ملاءِ اعلیٰ کی اصلیت کو اچھی طرح جانتے ہیں لہٰذا ان پر سارا فریب کھلا ہوا ہے اور لوگوں کو جان بوجھ کر گمراہ کرتے ہیں.... وادیٔ ایمن نے دنیا کو بہت خراب کیا؛ دین کو جتنا بڑا ضرر اس شخص کے ہاتھ سے پہنچا، شاید کبھی کسی کے ہاتھ سے نہ

پہنچا ہوگا: (ص ۱۵۱)
'افشائے راز'، اور 'انتقام'، ناول کے یہ دونوں ابواب ایک دوسرے سے منسلک اور ہم رشتہ
ہیں۔ پہلے باب میں فردوسِ بریں کا عقدہ کھلتا ہے، اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک مصنوعی
جنت ہے؛ جسے رکن الدین خورشاہ کی مادی تونگری کے بل بوتے پر تشکیل دیا گیا ہے۔ اس کے
جسمانی خدوخال پر ایک نظر پھر ڈال لینے میں کوئی حرج نہیں ہے:

"اس کے بعد وہ محل کے برآمدے پر کھڑا ہوا" اور ہر ایک عمارت اور ایک ایک چمن کو غور سے
اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا۔ ہر چیز وہی اور ویسی ہی تھی؛ جیسی کہ پہلے نظر سے
گزری تھی۔ قصروں کے روکار پر اسی طرح جواہرات جڑے تھے۔ ان کی وضع بھی ویسی ہی تھی۔
چمنوں کا وہی رنگ اور وہی نقشہ تھا۔ سڑکیں اور روشیں بھی اسی طرح رنگ برنگ اور نظر فریب
تھیں۔ سونے اور چاندی کے تخت آج بھی اسی پہلی شان سے بچھے ہوئے تھے نہریں اسی
مستانہ روی سے بہہ رہی تھیں۔ ہاں صرف ایک چیز کی کمی تھی۔ وہ یہ کہ وہ وجد میں لانے
والا گانا نہ تھا۔ مگر جب طیور کی زبان سے وہی ترانہ 'خیر مقدم' سن لیا، تو ادھر سے بھی شک
جاتا رہا۔ وہ اسی پس و پیش میں تھا کہ ایک طائر نے ایک تازہ اور شاداب سیب اپنی چونچ
میں لا کے اس کے سامنے ڈال دیا، اور وہ چونک کے بول اٹھا یہ بھی خاص فردوس بریں کی
علامت ہے۔" (ص ص ۱۴۰-۱۳۹)

ذہنی اور جذباتی طور پر اس کے پسِ پشت وہ باطنین اور فدائی ہیں، جن کا سلسلہ پایانِ کار حسن
بن صباح سے جا کر مل جاتا ہے۔ یہ مصنوعی جنت شداد کی تعمیر کردہ جنت سے مشابہ ہے۔ شیخ علی
وجودی اور شیخ الجبل کی طرح، بلکہ ان سے بڑھ کر رکن الدین خورشاہ اس امر کی استطاعت رکھتا
ہے کہ خالق و مخلوق، نورِ سرمدی اور اس کے اظلال، اور عالمِ لاہوت اور عالمِ ناسوت کے درمیان
واسطہ اور تعلق پیدا کر دے، اور چیدہ چیدہ لوگوں کو ملاءِ اعلیٰ کی سیر کرا دے۔ اس ملاءِ اعلیٰ کی حقیقت
اور اصلیت میں یقین کو مستحکم اور استوار کرنے کے لیے ایک پیچیدہ اور خوبصورت جال بچھایا گیا
ہے۔ فرقۂ ناجیہ کے پیرو، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا، مذہب یا عام طور پر انسانی رویوں کے
باطنی پہلوؤں پر زور دے کر معمولی لوگوں کو نہ صرف مذہبی بلکہ اخلاقی احکام اور پابندیوں سے



بھی آزادی اور لاتعلقی دلانے کو جزوِ ایمان اور کارِ خیر سمجھتے تھے اور اس کے پسِ پردہ وہ اپنے مخالفین
کے سلسلے میں ہر طرح کی سفاکی اور شقاوت کو جائز سمجھتے تھے اور خود ان کے اپنے کردار اور ردِ عمل کی
اساس وہ ریاکاری تھی، جو مذہب کو ایک ڈھال کے طور پر استعمال کرتی تھی اور اسی لیے اخلاقی ذمہ داریاں
ان کے لیے چنداں قابلِ اعتنا نہ تھیں۔ ان کی دلیل تین بنیادوں پر قائم تھی، نبوت اور امامت کے
مابین اولاً ان کے نزدیک یہ فرق ہے کہ اول الذکر کھلی ہوئی اور علانیہ تبلیغ پر تکیہ کرتی ہے اور موخر الذکر
مخفی تبلیغ پر:

"ہم اسمٰعیل بن جعفر صادق علیہ السلام کی امامت کے مدعی ہیں... ہم پر فرض ہے کہ اس
کی تبلیغ اور نقابت خفیہ اور باطنی طریقوں سے کریں۔ انوارِ ازلی نے یہ قدیم ہی سے فیصلہ
کر دیا ہے، کہ جب تک امامت ظاہر رہتی ہے نقابت و تبلیغ خفیہ ہوتی ہے اور جب
امامت مخفی و باطنی ہو جاتی ہے۔ تو نقابت و تبلیغ علانیہ ہونے لگتی ہے"۔ (ص ۹۰)

دوسرے یہ کہ نبوت اپنے متبعین کو ملاءِ اعلیٰ کی سیر نہ کراتی ہے اور نہ کرا سکتی ہے؛ جب کہ
امامت کے مدعی اور پیغام رساں برابر ایسا کرتے رہتے ہیں۔ "رسالت نے کبھی کسی مادی
پیکر کو اس سرو شبستان میں نہیں بھیجا اور امامت برابر بھیج رہی ہے۔ جس کا یہ قطعی نتیجہ ہے
کہ فردوس بریں اور نورِ ازلی پہلے مخفی تھے اور اب نمایاں ہیں"۔ (ص ۹۱)

اور تیسرے یہ کہ اول الذکر عبادت و ریاضت کو لازمی قرار دیتی ہے، اور موخر الذکر اس سے بے نیازی
اور لاتعلقی کو، کیونکہ جب خدا کا جلوہ جس کا حاصل کرنا عبادت کا منتہائے مقصود ہے، نظر آ جائے
تو پھر ظاہری ذرائع اور اعمال پر انحصار چنداں اہمیت نہیں رکھتا:

"جانتا ہے کہ ساری عبادتیں خدائے جلّ و علا کا قرب حاصل کرنے کے لیے ہیں، اور
جب وہ قربت حاصل ہو جائے، تو پھر کسی عبادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم نے سنا ہے
اور دیکھ بھی لیا ہوگا، کہ جنت میں کوئی شخص عبادت کا مکلف نہیں اس کا یہی منشا ہے کہ
اس تقربِ انوارِ لم یزلی کے لیے عبادت کرتے ہیں، اور وہ یہاں ہر ایک کو یوں ہی حاصل
ہوتا ہے"۔ (ص ص ۹۹-۹۸)۔

یہ ایک بہت ہی لطیف اور پُر پیچ حیلہ ہے مذہبی احکام کی بجا آوری سے روگردانی اور پہلوتہی کرنے کا

Scanned with CamScanner

قلعۂ التموت (اور یہ لفظ متین بمعنی مضبوط سے مشتق معلوم ہوتا ہے) کوہ البرز کی گھاٹی سے آگے چل کر ایک وسیع مرغزار کی انتہا پر واقع تھا۔ اس کے بارے میں زمرد کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:

"یہ باغ فدائیوں اور باطنیوں کے اعتقاد میں تو جنت الفردوس اور ملاء اعلیٰ کا سرمدی عشرت کدہ ہے؛ مگر سچ پوچھو تو شاہان التموت کے سراپا حرم کی حیثیت رکھتا ہے۔" (ص ۱۵۹)

زمرد کو اس میں اس لیے مقید کیا گیا تھا کیونکہ اس مصنوعی جنت کا بھرم قائم رکھنے اور اس کی کشش کو دوچند کرنے کے لیے زمرد جیسی ہوش ربا اور صاعقہ بردوش حسینہ کا وجود اس میں ضروری تھا اور خود خورشاہ اس پر بری طرح ریجھ چکا تھا، اور اسے اپنے تصرف میں لانا چاہتا تھا۔ دیدار کے ہاتھوں چغتائی خان کا قتل واقعات کی رفتار اور ناول کے عمل کو ایک آخری اور فیصلہ کن موڑ پر لے آتا ہے۔ قلعۂ التموت تک رسائی حسین کی صحبت میں اور زمرد کی ہدایات کے بموجب حاصل کی جاتی ہے؛ اور بلغان خاتون کو اسی طرح کے منحنی، تیرہ و تار اور بے حد خطرناک راستوں سے گزرنا پڑتا ہے؛ جن سے حسین اپنی پہلی مہم کے دوران گزرا تھا۔ قلعے کے قریب پہنچ کر ان کی ملاقات زمرد سے ہو جاتی ہے، جو ان دونوں کو پوری صورتِ حال سے تفصیل کے ساتھ آگاہ کر دیتی ہے؛ اور عین اس وقت جب کہ خورشاہ اور اس کے ہمراز اور ہمراہی ۲۷ رمضان المبارک کو عید قائم قیامت کی تقریبات اور رنگ رلیاں منانے میں مصروف نظر آتے ہیں، ہلاکو خاں کی سرکردگی میں تاتاریوں کی 'فوجِ ظفر موج' بلغان خاتون کی مدد کے لیے آموجود ہوتی ہے، اور ان سب شعبدہ بازوں اور فتنہ پردازوں کو جو ایک طویل عرصے تک ذہنی اور جسمانی طور پر لوگوں کو فسق و فجور میں مبتلا کرتے اور خراب کرتے رہے تھے، پلک جھپکتے میں چٹکیوں میں مسل کر رکھ دیتی ہے۔

ناول کے شروع کے ابواب میں 'فردوس بریں' کا جو فریب کن نقش اجاگر کیا گیا تھا، اس کا انہدام یعنی DEMOLITION سب سے آخری باب میں سامنے لایا جاتا ہے۔ موت اور تباہی کا یہ منظر، جس کی مادی تجسیم یہاں پیش کی گئی ہے، ایک طرح کی ڈرامائی وقعت رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہاں چہروں پر ایک مدت کے پڑے ہوئے نقاب بڑی بے دردی کے ساتھ نوچ نوچ کر علیحدہ کر دیئے جاتے ہیں؛ شیخ علی وجودی، شیخ الجبل اور کاظم جنونی کو ایک ایک



کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف انہیں بلکہ فرقۂ ناجیہ باطنیہ اور فرقۂ ملاحدہ کے جو لوگ بھی یہاں جمع ہیں۔ ان میں سے کم و بیش سب ہی کو موت کا زہر بھرا جام اپنے حلق کے نیچے اتارنا پڑتا ہے۔ موت کا یہ منظر جس میں لاشیں بلا امتیاز اوپر تلے اکٹھا ہو رہی تھیں، اس طرح سامنے لایا گیا ہے:

"ہلاکو خاں اور بلغان خاتون کے ہمراہی خورشاہ کے محل کے ایک ایک کمرے اور دالان میں گھس گھس کر خوف زدہ عورتوں اور مردوں، بوڑھوں اور بچوں کو نکال نکال کر ہنکاتے ہوئے اس بڑے میدان میں لائے، جہاں پر چند منٹ پہلے عید کا جشن ہو رہا تھا، اور عیش و عشرت کے پُرجوش نعرے بلند تھے۔ دوسری طرف سے باہر بھاگنے والوں کو طوبی خاں کے ہمراہیوں نے نہایت ہی بدحواسی کے ساتھ بھگا کے اندر کیا۔ وہ بھی اس میدان میں آ کے مظلوم و پریشان دوستوں سے اندھوں کی طرح ٹکرانے لگے۔" (ص ۱۷۷)

آخری جملے سے ایک نہایت ہی بے ڈول، وحشت ناک یعنی BIZARRE قسم کا تاثر ابھرتا ہے؛ اور ایسا ہی تاثر، جس سے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہیں، ان جملوں میں نظر آتا ہے:

"تھوڑی دیر میں قلعے کی نصف سے زیادہ آبادی قتل ہو گئی لاشیں ہر طرف تڑپ رہی تھیں۔ وہ ہر طرف سے پھڑکتی ہوئی آ آ کے بہت سی ایک مقام پر جمع ہو جاتیں اور ایک دوسرے کو اپنے خون میں رنگتیں اور باہم اچھل اچھل کر لپٹتی تھیں۔ مگر قاتلوں کا خیال بھی اس طرف نہ جاتا تھا۔ وہ برابر نئے نئے بے سر دھڑوں کو گرا گرا کر انھیں تڑپتی ہوئی لاشوں کے تودوں کی طرف پھینک رہے تھے۔" (ص ۱۷۹)۔

لیکن بہیمیت کا یہ منظر ہمیں کسی قسم کے اخلاقی احتجاج پر نہیں اکساتا۔ شیخ علی وجودی اور شیخ الجبل کو حسین خود اپنے ہاتھ سے تہِ تیغ کر دیتا ہے۔ کیونکہ ان دونوں نے اس کے چچا اور استاذ امام نجم الدین نیشاپوری کے اور امام نصر بن احمد جیسے عالمانِ بے بدل اور ائمۂ معصومین کے قتل ناروا پر حسین کو ورغلایا تھا۔ اول الذکر کے قتل کا جواز زمرد کی زبانی اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اس طرح زمانے بھر کو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب باطنیہ دلوں پر کس قدر گہرا اثر ڈالتا ہے، کہ انسان اپنے عزیز و اقارب، استاذ و مرشد تک کی پرواہ نہیں کرتا۔ تمہارے خنجر سے ان کا

قتل ایک سانحہ اتنی باتوں کا ثبوت دے سکتا تھا کہ بھتیجے نے چچا کو، شاگرد نے استاد کو، مرید نے مرشد کو بلا تامل ثواب سمجھ کر قتل کر ڈالا۔" (ص ۱۴۴)۔

بہ الفاظِ دیگر اس سفاکانہ جرم کا ارتکاب بھی ایک طرح کی منصوبہ بندی پر منحصر تھا۔

ناول کے تیسرے باب 'ملاءِ اعلیٰ کا سفر' میں الجب سے حسین کی ملاقات کاظم جنونی کے ذریعے کرائی جاتی ہے۔ اس ملاقات کے منظر میں ایک طرح کے ڈرامائی تناؤ کو بڑا دخل ہے۔ بہت سے نشیب و فراز طے کر کے اور دشوار گذار گھاٹیوں کو عبور کر کے کاظم جنونی ایک بڑے غار کے دہانے پر جا کر ٹھہر گیا۔ "اور دور سے چلایا: یا شیخ الجب! ظلمت مادی میں ایک جگنو چمکا ہے۔ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ پھر کاظم جنونی نے پکار کر کہا: ایک آئینے سے پردہ اٹھا۔ جو تجلیاتِ انوار لاہوتی سے منعکس ہونا چاہیے۔" اب بھی کوئی آواز نہ آئی۔ کاظم جنونی نے پھر پکارا: ایک آفتینجی پیکر کا مقید اسرار سرورِ شبستان جاننے کے لیے بے صبر ہے: اس تیز صدا پر غار کے اندر سے چٹانوں میں گونجتی اور اندھیرے میں سنسناتی ہوئی آواز آئی۔ مرحبا! جوان آملی مرحبا، جنت کی ایک حور دو سال سے تیرے فراق میں بے تاب ہے۔ میں نے اپنی سیرِ لاہوتی میں ایک طرف اس کو فردوس بریں کے کوشکوں میں روتے اور دوسری طرف تجھے راہِ طلب میں قدم مارتے دیکھا ہے"۔ (ص ۵۸)۔ 'جوان آملی' سے مراد حسین اور 'جنت کی ایک حور' سے مراد زمرد ہے۔ یہاں ساری گفتگو لوز کے اسی مسخ شدہ رمز کی رعایت سے کی گئی ہے، جو اس ناول کا مرکزی استعارہ ہے اور الجب کی چٹانوں میں گونجتی اور اندھیرے میں سنسناتی ہوئی آواز، صرف ایک آواز نہیں ہے، بلکہ یہ ایک پراسرار شخصیت کو آشکار کر رہی ہے۔ یہ اشارہ ہے ایک مہیب 'دیو پیکر وجود' یعنی PRESENCE کا جو فوراً اعصاب پر اپنا تسلط قائم کر لیتا ہے اور پھر انہی شیخ الجب کا حلیہ ایک دوسرے پس منظر میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"ایک قوی الجثہ اور نہایت نورانی صورت کا آدمی نظر آیا، جو زرنار مسند پر گاؤ سے لگا ہوا عجب بے پرواہی اور بے نیازی کی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کا نورانی چہرہ آئینے کی طرح صاف تھا اور اس وقت چاروں طرف شمعوں اور نیز در و دیوار کے شیشوں کی ضو پڑنے سے آفتاب کے مثل چمک رہا تھا اور سفید لمبی داڑھی، تقدیس کی جھالر یا آفتاب کی کرنوں کا دھوکہ دیتی تھی۔" (ص ۵۹)۔



یہاں 'نور'، 'نورانی آفتاب کی مثل چمکنا' اور 'آفتاب کی کرنوں کا دھوکہ دینا' یہ سب مطابقت رکھتے ہیں 'الجب کے لقب 'طور معنیٰ' میں لفظ 'طور' سے۔ اس سیاق و سباق میں ان 'طور معنیٰ' کا انجام کتنا عبرت خیز نظر آتا ہے۔ کاظم جنونی کا صفایا کرنے کے بعد حسین الجب کی طرف متوجہ ہوا:

"حسین نے اس مجمع کے اندر ہاتھ ڈال کر باہر اسے کھینچا۔ اور کہا آج تو میں نے وہ ستر ہزار حجاب خود ہی چاک کر ڈالے اور طور سینا کو بے نقاب، دیکھ رہا ہوں'..... حسین نے اس کے منھ پر تھوک دیا اور کہا: یا تو وہ کشف تھا، کہ بغیر اس کے میری صورت دیکھے یا میری آواز سنے، تو نے کہا تھا: اے نوجوان آملی، مرحبا! یا آج مجھے دیکھ کر بھی نہیں پہچان سکتا۔ تیری سب سازشیں کھل گئیں، اور معلوم ہو گیا کہ تو کتنا بڑا مکار و بدمعاش ہے" (ص ۱۸۰)

اور وہ بالآخر موت کے تنور میں جھونک دیا جاتا ہے۔

اسی رستاخیز میں حسین کی مٹھ بھیڑ شیخ علی وجودی سے ہوتی ہے۔ ان کے درمیان یہ مکالمہ قابلِ غور ہے:

علی وجودی: اور حسین یہ فتنہ کیوں کر برپا ہوا؟ یقین ہے کہ تجھے معلوم ہوگا، اس لیے کہ تیرے کہنے سے تاتاریوں نے میری جان چھوڑی

حسین: آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ آپ کو تو ہر امر ایک ادنیٰ توجہِ قلبی سے معلوم ہو جاتا ہے۔

علی وجودی: اتنا جاننے پر بھی تو عالمِ ارواح کے رموز سے ناآشنا ہے۔ جن لوگوں کو ان رموز میں کمال حاصل ہوتا ہے، انھیں کو کبھی اپنی خبر نہیں رہتی۔ (ص ۱۸۳)

اس مکالمے میں تجسس کا محرک ہمارے حافظے کو ناول کے دوسرے باب کی طرف پلٹ دیتا ہے، جہاں شیخ علی وجودی نے کہا تھا:

"وَلَا تَجَسَّسُوْا! ان رموز کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے اگر سچا شوق ہے تو کبھی خود ہی سارا راز کھل جائے گا۔ اب حرف سوال تیرے منھ سے نکل گیا، لے بتائے دیتا ہوں۔ جو لوگ خدا کے انوارِ ازلی و سرمدی کا انعکاس اپنے دل پر کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے

حجاب کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور جہاں جہاں وہ الزاری اپنی کرنیں ڈالتا ہے۔ وہاں ان کی آنکھوں
کی شعاعیں بھی پہنچ جاتی ہیں"؛ (ص ۳۳)۔

ان جملوں میں ایک طرح کے ڈرامائی طنز (DRAMATIC IRONY) کی کارفرمائی ملتی ہے، جس کا احساس اس وقت نہیں ہوتا، جب یہ جملے شیخ علی وجودی کے نام سے ادا کرائے گئے ہیں، لیکن اگر ان جملوں (ص ۳۳) کو اُن جملوں (ص ۱۸۳) سے مربوط کر کے پڑھا جائے۔ تو اس سے صاف ظاہر ہو جائیگا کہ شیخ علی وجودی جس التباس میں دوسروں کو گرفتار کرنے کے درپے رہتا ہے، وہ خود اسی کا اسیر ہو جاتا ہے اور اصلیت اس پر اس وقت کھلتی ہے، جب اس کا کوئی مداوا ممکن نہیں۔ وہ بھی گڑگڑاتا اور حسین کی منت و سماجت کرتا ہے کہ اس کی جاں بخشی کردی جائے مگر ایک نہیں جاتی۔ اس کے قتل کے سلسلے میں یہ جملے اپنے اندر بڑی معنویت رکھتے ہیں:

"درحقیقت علی وجودی کی موت بہت بڑی موت تھی۔ اس وقت تمام گناہ طرح طرح کی بھیانک صورتوں کا جامہ پہن کر اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑے تھے، وہ سر بزیر باسقنوم رکوں کو دیکھ رہا تھا، جو خنجر دکھا دکھا کر اسے ڈرا اور دھمکا رہی تھیں۔ اس نے ان تمام چیزوں سے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں، اور حسین نے کہا، خدا کے لیے مجھے چھوڑ دے، اور میری بے کسی پر رحم کھا۔" (ص ۱۸۵)۔

یہ ایک بہت ہی بھیانک قسم کا فریبِ خیال یعنی HALLUCNATION ہے، جس سے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اور ایسا لگتا ہے کہ ان تمام ستم رسیدہ اور آفت زدہ انسانوں کی روحیں جو اس کے ظلم و جور اور تشدد اور بربریت کا نشانہ بنے تھے، بیک وقت اس کی شقی القلبی پر شہادت دے رہی ہیں۔

شیخ علی وجودی اور شیخ الجبل کا سارا روحانی جلال اور نخوت و تکبر چشم زدن میں خاک میں مل جاتا ہے۔ اور یہ جلال اور نخوت ان کی مکاری اور دروغ بافی کی پردہ پوشی کرتی رہی تھیں۔ اسی طرح فرماں روائے الموت رکن الدین خورشاہ بھی ہلاکو خاں کے دستِ قضا میں پڑ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ اسے قتل نہیں کیا جاتا، بلکہ ترکستان کے کسی گمنام قریے میں دور دراز مقام پر بھیج دیا جاتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ شیخ علی وجودی اور شیخ الجبل نے لوگوں کے دلوں میں گھس کر دین و اخلاق کے نام پر جتنا نقصان پہنچایا تھا، اتنا خورشاہ نے نہیں پہنچایا۔ ایک مزید وجہ شاید یہ ہو



کہ جب اس کے درباری حسین کے گستاخانہ جملے سن کر بھڑ پڑے تھے، اور اسے قتل کر دینے پر تلے ہوئے تھے، تو اسی خورشاہ نے حسین کی طرف دیکھ کر کہا تھا:

"اس گستاخی اور بدتمیزی کی سزا میں تم سے کہا جاتا ہے، کہ فوراً قلعے سے باہر نکل جاؤ۔ اور تم ہرگز اس کے مجاز نہیں کہ فردوسِ بریں کی پاک زمین تمہارے قدم سے ناپاک کی جائے۔ تمہاری سزا قتل تھی، چند ایسے اسباب ہیں جن کی وجہ سے تمہارے قتل کو مناسب نہیں خیال کرتا،" (ص ۱۰۸)

البتہ ایک ایک کر کے سارے فدائی اور باطنی خاک و خون میں لتھڑے نظر آتے ہیں اور وہ سارے دلکش و دلفریب مناظر، جو فطرت کے بے پایاں حسن اور انسانی فطانت کی ہنرمندی کی آمیزش سے ایک التباس پیدا کرتے تھے، اور تعیش و بے فکری کے جملہ اسباب دیکھتے دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں اور اردگرد کی تمام اشیاء آن کی آن میں تودۂ خاک بن کر رہ جاتی ہیں:

"اور یہاں یہ ہوا کہ جب قلعہ آدمیوں سے خالی ہو گیا تو تاتاری لٹیرے دولت لوٹنے، محلوں کو کھودنے اور آگ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ محل اور جنت میں ہر جگہ آگ لگادی گئی۔ وہ قصر اور کوشکیں کھود کے زمین کے برابر کردی گئیں، اور باغ اور محل، جو جنت بنے ہوئے تھے، اور جنت ہی سمجھے جاتے تھے، محض مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر رہ گئے اور تاتاریوں نے انھیں آناً فاناً ایسا کردیا، کہ نہ کوئی رہنے والا تھا، اور نہ رونے والا!" (ص ۱۸۸)

مذہب و اخلاق کو ریاکاری اور انتفاع کے لئے استعمال کرنے کا اس سے بڑھ کر منطقی، حسرت ناک اور عبرت انگیز انجام کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا تھا۔ زمرد کا ردِعمل اس کے برخلاف ایک ناتجربہ کار اور الڑھ دوشیزہ کا ردِعمل ہے۔ جسے معصومیت کے اس دائرے سے نکل کر تجربے کی دنیا کی طرف قدم بڑھانا ہے۔

"تم خوش ہو تو جس کا دل خدا نے پتھر کا بنایا ہے۔ ایسا وحشت ناک منظر دیکھنا بھی میرے خیال میں بھی نہ گذرا تھا۔ میں ایسی حالتوں کے دیکھنے کی عادی نہیں ہوں"! (ص ۱۸۸)۔

یہ انہدام، بہرحال ایک فن کارانہ طریقے سے سامنے لایا گیا ہے۔ اس ناول کی فضا ایک پرچھائیں کی دنیا — SHADOW WORLD کی سی ہے، جو ٹھوس اور مادی کائنات اور دلفریب کن کائنات کے مابین ایک غیر متزلزل یعنی UNSTABLE توازن رکھتی ہے اور ہمارے ردِعمل کو بڑی حد تک غیر متعین بناتی ہے۔

---

Scanned with CamScanner

# فردوس بریں کا موضوع، قِصّہ اور پلاٹ

## موضوع و پس منظر:

فردوس بریں کو اپنے موضوع کے اعتبار سے فرقہ باطنیہ کے عروج و زوال کی داستان کہا جاسکتا ہے۔ فرقہ باطنیہ دراصل فرقہ اسماعیلیہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ خلفائے فاطمین مصر اس مذہب کی سرپرستی کرتے تھے لیکن ابتداً اس کی تلقین خفیہ طریق پر ہی ہوتی تھی۔ جن لوگوں کو معتقد بنایا جاتا ان کی تربیت کے نو مختلف مدارج تھے پہلے درجے میں دین اسلام کے بارے میں کچھ شبہات پیدا کیے جاتے تاکہ معتقد کے دل میں ان کے دور کرنے کا شوق پیدا ہو اور ساتھ ہی مذہب اسماعیلیہ کے چند معمولی اصول بتائے جاتے۔ دوسرے درجے میں مسئلہ امامت اور امامت سے متعلق رموز ربانی کی تعلیم دی جاتی، تیسرے درجے میں اسماعیلی مذہب کے خاص خاص عقائد کی تعلیم ہوتی اور سات اماموں میں سے اسماعیل بن جعفر صادق علیہ السلام کے سب سے بڑے امام ہونے کا اعتقاد پیدا کیا جاتا، چوتھے درجے میں بتایا جاتا کہ صرف سات صاحب شریعت پیغمبر ہوئے ہیں اور ہر بعد میں آنے والے نے پہلے کی شریعت میں ضروری ترمیم کو روا رکھا۔ وہ سات صاحب شریعت پیغمبر آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ، محمدؐ اور اسماعیل بن جعفر صادق ہیں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک خاموش پیغمبر بھی تھا جس نے ان کی شریعت کو استحکام بخشا اور وہ سات خاموش پیغمبر شیث، سام، اسماعیل، ہارون، شمعون، علی بن ابی طالبؓ اور محمد بن اسماعیل بن جعفر صادق ہیں۔ پانچویں درجے میں یہ بتایا جاتا کہ فضیلت کے اعتبار سے بارہ کا عدد سات سے افضل ہے اور ہر خاموش پیغمبر نے دین کی ترویج کے لیے اپنی طرف سے بارہ داعی مقرر کیے تھے۔ ان پانچ بنیادی درجوں میں مریدوں کو پوری طرح معتقد بنا کر اور ہر امر میں داعی اور شیخ کی اطاعت کا درس دے کر چھٹے درجے میں داخل کیا جاتا جس میں یہ تعلیم دی جاتی کہ جملہ احکام شرع فلسفے اور

عقل کے تابع ہیں۔ ساتویں درجے میں علم جفر کی تعلیم آٹھویں درجے میں حرکات وافعال انسانی اور روح کے باہمی تعلق اورنویں درجے میں ہرشے کے بارے میں بے یقینی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

اس خفیہ طریق تبلیغ سے اسماعیلیوں کی تعداد کافی بڑھ چکی تھی اور اسی زمانے میں حسن صباح نے آنکھ کھولی۔ اس کے لڑکپن کے ہم جماعتوں میں نظام الملک طوسی بھی تھے۔ حسن صباح تعلیم سے فارغ ہوکر مارامارا پھرتا رہا کہ اسے معلوم ہوا نظام الملک، ملک شاہ کا وزیر ہے، حسن صباح، نظام الملک سے ملا، اس نے ہرطرح خاطر مدارات کی، حوصلہ افزائی کی اور ملک شاہ کے دربار تک اس کی رسائی کرائی لیکن حسن صباح نے نظام الملک کا عہدہ خود حاصل کرنے کے لیے سازش کی جس میں ناکام رہااور ملک شاہ نے اس کی جان بخشی کرتے ہوئے صرف ملک بدر کردینے پر اکتفا کیا۔ حسن صباح شام سے نکل کر اصفہان گیا اور وہاں کے رئیس ابوالفضل کا مہمان ہوا۔ ایک دن اس نے ابوالفضل سے کہا اگر مجھے دو یا تین سچے دوست مل جائیں تو سلجوقی قوت کو ختم کردوں۔ ابوالفضل نے سلجوقی قوت اور حسن صباح کی حالت کے پیش نظر اس بات سے یہ قیاس کیا کہ وہ پاگل ہوگیا ہے اس لیے ایک طبیب کو بلا کر باقاعدہ اس کی دیوانگی کا علاج شروع کرادیا۔ حسن صباح اس حالت سے تنگ آکر وہاں سے نکل بھاگا۔ اسی زمانے میں ایک دوست ملا جو اسماعیلی تھا اس سے بحث مباحثے ہوتے رہے اور حسن صباح دل میں قائل ہوگیا کہ مذہب اسماعیلیہ ہی سب سے بہتر مذہب ہے اور خلفائے مصر ہی وہ اصلی اور حقیقی امام ہیں جن کی پیروی مسلمانوں پر فرض ہے۔ اسی اثناء میں وہ بیمار پڑ گیا اور بیماری میں یہ بات پریشان کرنے لگی کہ "اگر مرگیا تو باطل مذہب پر مروں گا مذہب اسماعیلیہ اختیار نہ کرسکنے کی وجہ سے نجات سے محروم رہوں گا۔" صحت یاب ہوتے ہی ایک داعی سے ملا اور اس کے گروہ میں شامل ہونے کی درخواست کی اور کچھ عرصہ بعد خود حسن صباح کو بھی تبلیغ ودعوت کی اجازت مل گئی۔ چند ہی دنوں میں اسماعیلیوں میں کافی مشہور ہوگیا پھر وہ مصر میں خلیفہ المستنصر (جسے اسماعیلی امام زمانہ سمجھتے تھے) سے ملنے گیا۔ خلیفہ بہت التفات اور توجہ سے ملا۔ دیگر درباریوں کو حسن صباح کی یہ قدر ومنزلت دیکھ کر حسد ہوا اور انھوں نے موقع پاکر اسے پادریوں کے ایک جہاز پر پھنکوادیا جو افریقہ کی طرف جارہا تھا۔ یہ جہاز راستے میں بلاخیز طوفان میں گھر گیا، ہرکوئی زندگی سے مایوس ہوچکا تھا لیکن حسن صباح بہت مطمئن تھا۔ اس کے ذہن نے ایک ترکیب سوچی اور سب کو بڑے اعتماد سے مخاطب کرکے کہنے لگا: "مجھ سے

خدا نے وعدہ کیا ہے فکر کی کوئی بات نہیں ہم نہیں ڈوبیں گے۔'' اس میں اس کی حکمت یہ تھی کہ ڈوب گئے تو کوئی تکذیب کرنے والا نہیں بچے گا اور بچ رہے تو پھر اپنی چاندی ہے۔ تھوڑی دیر بعد طوفان تھم گیا سب اس کے مقبول بارگاہ الٰہی ہونے پر ایمان لے آئے اور اس کی دعوت اسماعیلیہ قبول کر لی۔

الغرض اسی طرح پھرتے پھراتے مہینوں برسوں مختلف علاقوں میں تبلیغ کرتا ہوا قزوین کے شمال میں علاقہ رودبار کے قلعہ الموت میں پہنچا جہاں مہدی نامی قلعدار تھا۔ حسن صباح نے اپنی حکمت عملی سے قلعہ الموت پر قبضہ کر لیا۔ اس قبضے کے ضمن میں دو مختلف روایات ہیں۔ ایک روایت یہ کہ حسن صباح نے قلعہ میں قیام کر کے بہت سے لوگوں کو اپنے تقویٰ سے متاثر کیا جن میں خود مہدی بھی شامل تھا پھر حسن صباح نے مہدی سے کہا کہ یہ کنج تنہائی اسے پسند ہے لہٰذا تین ہزار درہم کے عوض اسے ایک بیل کی کھال کے برابر جگہ دے دی جائے۔ اس نے قبول کر لیا۔ بیع نامہ ہو گیا تو حسن صباح نے بیل کی کھال کی باریک تاریں بنا کر جوڑیں جو سارے قلعے کو محیط تھیں چنانچہ مہدی کو حسب معاہدہ قلعہ چھوڑنا پڑا اور دوسری روایت یہ کہ حسن صباح نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کے زور سے مہدی کو زبردستی قلعے سے نکال باہر کیا۔

قلعہ الموت اپنے محل وقوع کے اعتبار سے انتہائی محفوظ مقام تھا۔ الہ موت کے معنی عقاب کا گھونسلا ہیں اور روایت ہے کہ سلاطین دیلم کے ایک بادشاہ نے یہ قلعہ تعمیر کرایا تھا۔ اس بادشاہ کو شکار کا بہت شوق تھا اور ایک مرتبہ اس کا عقاب شکار پر جھپٹا اور اُسے دبوچ کر اس جگہ آ بیٹھا۔ دیلمی زبان میں ''الہ موت'' کے کلمے سے عقاب سدھائے بھی جاتے ہیں۔ چنانچہ بادشاہ کے ہمراہی الہ موت الہ موت پکارتے ہوئے اس طرف دوڑے۔ بادشاہ نے اس مقام پر اتنی بلندی پر مسطح تختہ زمین دیکھ کر اسے پسند کیا اور مضبوط قلعہ بنوایا جو اس کے بعد سے الموت ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔

حسن صباح نے ۶ رجب ۴۸۳ھ کو الموت پر قبضہ کیا۔ الموت کے لفظ سے قبضے کی یہ تاریخ بھی نکلتی ہے۔ حسن صباح نے قبضے کے بعد قلعے کے استحکام پر ہر طرح سے پوری پوری توجہ دی اور اسے ہر اعتبار سے ناقابل تسخیر بنایا۔ اس کے متصل پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی میں باغات لگوائے اور پانی کی قلت کو دور کرنے کے لیے رود الموت سے ایک نہر کاٹ کر لائی گئی جو سارے

Scanned with CamScanner

قلعے اور باغات کو سیراب کرتی تھی۔ پانی کے ذخیرے کے لیے چٹانوں میں بڑے بڑے حوض تعمیر
کرائے گئے۔ ان انتظامات کے علاوہ حسن صباح نے اپنی فوجی قوت بڑھانے کے مختلف طریقے
اختیار کیے۔ رودبار الموت کے قریب کے بہت سے دیگر قلعوں پر بھی قبضہ کرلیا گیا۔ حسن کا گروہ
فرقہ باطنیہ کہلانے لگا اب اس کے معتقد نہ صرف ایران بلکہ دور دراز ملکوں اور علاقوں میں پھیلے
ہوئے تھے، یہ گروہ عام معتقدوں کے علاوہ داعی، رفیق اور فدائی تین مختلف جماعتیں بھی رکھتا تھا۔
''فدائی تنظیم'' دراصل حسن صباح کی انتہائی خوفناک عسکری تنظیم تھی۔ پہلے پہل اسی نے حشیش
(بھنگ) کی یہ صفت معلوم کی کہ اس کے پینے سے نشے اور بے ہوشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔
چنانچہ قلعے سے متصل ایک خفیہ سیر گاہ میں جہاں باغات اور نہریں بڑے سلیقے سے بنائی گئی تھیں
ایک جنت تیار کی گئی۔ سادہ لوح عوام کو جب معتقد بنا کر لایا جاتا تو بھنگ کے نشے میں انھیں اس
سیر گاہ میں پہنچا دیا جاتا جہاں حسین و خوبصورت عورتیں ان کا دل بہلاتیں اور یہ باور کراتیں کہ وہ
حوریں ہیں اور وہ مقام ملاء اعلیٰ پر فردوس بریں ہے۔ پھر ہفتہ عشرہ ان لوگوں کو وہاں رکھ کر اسی
''شراب طہور'' (بھنگ) کا ایک جام پلایا جاتا اور جب ان کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے آپ کو قلعے میں
پاتے۔ چنانچہ دوبارہ اس جنت میں پہنچنے کے لیے وہ مرشد کے ہر حکم کی تعمیل آنکھیں بند کر کے
کرتے خواہ اس میں ان کی اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جاتی۔

اب حسن صباح جس مذہب کی طرف دعوت دے رہا تھا اس کا تعلق برائے نام اسماعیلیہ
مذہب سے تھا جیسے کہ قرامطین نے اسماعیلیہ عقائد میں حسب منشا تبدیلیاں کر لی تھیں اسی طرح
حسن صباح نے بھی ظاہری نام تو اسماعیلیہ کا ہی رکھا کیونکہ اس میں سیاسی فائدہ تھا لیکن اس کے
اصل عقائد میں اپنی ضرورت اور مرضی کے مطابق بنیادی تبدیلیاں کر لیں۔ یہاں ان عقائد کی
تفصیلی بحث سے اجتناب کرتے ہوئے دو تین بنیادی باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان
لوگوں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ اصلی اسمٰعیلیہ وہ خود ہیں اور یہ بات درست نہیں کہ امام صرف بارہ
ہو سکتے ہیں۔ ان کے عقیدے کے مطابق اماموں کا سلسلہ سات سات کے کئی سلسلوں میں ہو سکتا
ہے البتہ بارہ کی قید صرف نقیبوں کے لیے ہے کہ ہر امام کے بارہ نقیب ہونے چاہئیں۔ ان لوگوں
نے حکومت کی بعض مداخلتوں سے بچنے کے لیے یہ خیال پیدا کیا کہ جب تک امامت مخفی رہتی ہے
اس کی تبلیغ اور نقابت ظاہر ہوتی ہے اور جب امامت خود ظاہر ہو تو اس کی نقابت اور دعوت مخفی ہونے

Scanned with CamScanner

لگتی ہے۔اس طرح انھوں نے اپنے معتقدوں کے دلوں میں اپنے عقاید کی خفیہ تبلیغ کا ایک جواز پیدا کیا اور خفیہ سازشوں کے لیے راہ ہموار کر لی۔ان لوگوں نے خدا کو معریٰ اور معطل بنا دیا۔وہ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ اس کی جملہ صفات عین ذات ہیں بلکہ یہ عقیدہ پھیلایا کہ اس میں کوئی صفت ہی نہیں اگر صفات ہوں تو وہ مخلوق کی طرح ہو جائے اور تشبیہہ لازم آئے، اس لیے اس کی جانب کوئی صفت منسوب نہیں کی جاسکتی۔جو صفات منسوب کی جاتی ہیں ان کا یہ مقصد نہیں کہ وہ خود اس میں موجود ہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ اس نے وہ صفات مخلوق کو عطا کیں وہ قادر اس معنی میں نہیں کہ خود قدرت رکھتا ہے بلکہ اس معنی میں ہے کہ اس نے دوسروں کو قدرت عطا کی۔اس لیے یہ لوگ ہر صفت کے ساتھ نفی کا صیغہ استعمال کرتے اور خدا کو نور کہنے کی بجائے نور لا نور، حی لا حی وغیرہ کہتے۔ان کا ایک عقیدہ جس کی وجہ سے وہ باطنیہ کہلائے یہ تھا کہ ہر حکم ظاہر کا ایک باطن ہوتا ہے۔یہ عقیدہ سب سے زیادہ خطرناک تھا کیونکہ اس کی رو سے ان کے داعی احکام شرعیہ میں ہر قسم کا تصرف کر لیتے تھے اور اس کا جواز یہ تھا کہ تنسیخ شرع کے حکم ظاہری کا ایک باطن ہے جو عام آدمی کی نظر میں نہیں آسکتا۔اس طرح وہ اپنے پیروؤں کو بے تکلف ہر خلاف شرع کام کا حکم دیتے اور وہ اس کی تعمیل کو عاقبت سمجھ کر پورا کرتے۔

ہم قبل ازیں حسن صباح کے فدائیوں کے گروہ کا ذکر کر چکے ہیں۔اس نے اس گروہ کی تنظیم پر پوری توجہ دی۔انھیں خنجر زنی کی خصوصی مشق کرائی جاتی تھی۔خود حسن صباح نے اپنی روحانیات سے متاثر کرنے کے لیے تنہائی اختیار کر لی اور قصر الموت کے بالاخانے پر اس طرح بیٹھا کہ ۳۰ برس میں صرف دو بار نیچے اُترا۔مخصوص لوگوں کے سوا کسی سے نہیں ملتا تھا اپنی شریعت پر سختی سے عمل پیرا تھا اور اس کے نفاذ میں کسی کے رو رعایت روا نہ رکھتا تھا۔اس کی شریعت کے خلاف عمل کی سزا قتل تھی۔اس معاملے میں وہ اس حد تک سخت گیر تھا کہ اس کے دونوں بیٹے خلاف شریعت عمل کرنے کے جرم میں اس کے حکم سے قتل ہوئے۔حسن صباح کی بڑھتی ہوئی قوت کا سد باب کرنے کے لیے ملک شاہ نے فوج کشی کا ارادہ کیا۔اس سے پہلے ملک شاہ نے حسن صباح کے پاس سفیر روانہ کیا جسے متاثر کرنے کے لیے حسن صباح نے ایک فدائی کو بلا کر خنجر سے خودکشی کرنے کا حکم دیا، فوری تعمیل ہوئی۔دوسرے فدائی کو بلا کر قلعے کے اونچے برج سے چھلانگ لگا دینے کا حکم دیا اس نے بھی فوری تعمیل کی۔سفیر یہ بھیانک منظر دیکھ کر لوٹ گیا۔چنانچہ ملک شاہ کے حکم سے نظام الملک

Scanned with CamScanner

طوسی نے الموت کے محاصرے کے لیے فوجیں بھیج دیں۔ حسن صباح اس محاصرے سے بالکل خوفزدہ نہ ہوا کیونکہ اسے یقین تھا کہ الموت نا قابل تسخیر ہے لیکن قلعے والوں کی زراعت موقوف ہو جانے کی بنا پر قحط کا اندیشہ لاحق ہوا چنانچہ اس نے اپنے جانبازوں سے پوچھا کہ نظام الملک کے فتنے کو ختم کرنے کا ذمہ کون لیتا ہے؟ ایک فدائی نے خود کو پیش کیا اور چند دنوں بعد جبکہ نظام الملک، ملک شاہ کے ساتھ زند میں قیام پذیر تھا لشکر گاہ میں اس فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔ یہ فدائیوں کے ہاتھوں پہلا قتل تھا لیکن پھر یہ سلسلہ ایک نہ تھمنے والے طوفان کی صورت اختیار کر گیا اور حسن صباح کے بعد اس کے جانشین بھی اسی طریق کو آخر دم تک اپنائے رہے۔ سلطان سنجر نے بھی ایک بار محاصرہ کیا لیکن ایک صبح جب وہ لشکر گاہ کے وسط میں نصب اپنے خیمے میں سو کر اٹھا تو اس کے سرہانے زمین میں ایک خنجر گڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی حسن کی طرف سے یہ تنبیہہ بھی کہ وہ سلطان کو اچھا سمجھتا ہے ورنہ یہ خنجر سرہانے کی بجائے اس کے سینے میں اترا ہوتا۔ حسن صباح ۳۵ برس اس قلعے پر قابض رہا۔ مرنے سے پہلے اس نے قلعدار الموت کیا بزرگ امید کو نائب نامزد کیا۔ اس کی معاونت کے لیے تین اور سردار مقرر کیے اور کہا کہ اس وقت تک نظام چلائیں جب تک نیا امام ظاہر نہ ہو جائے۔

فدائیوں کے ہاتھوں ڈیڑھ سو برس کے عرصے میں لاتعداد فقیہ علماء، فضلا، امراء حتیٰ کہ سپہ سالار، سلاطین اور خلفاء بھی قتل ہوئے۔ جب محمد ثانی باطنیوں کا بادشاہ تھا امام فخرالدین رازی باطنیوں کے خلاف زور شور سے وعظ کہا کرتے تھے۔ ان کے تلامذہ میں سے ایک (جو فدائی تھا) ایک دن تنہائی میں موقع پا کر ان کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور گلے پر خنجر رکھ دیا اور کہا کہ یہ باطنیہ کے خلاف وعظ کی سزا ہے۔ امام نے منت سماجت کی اور آئندہ ان کے خلاف کچھ نہ کہنے کا وعدہ کیا۔ فدائی سینے سے اترا اور کہا امام یہ نہ سمجھیں کہ اس نے ان کی منت وزاری سے متاثر ہو کر یا وعدے پر یقین کر کے چھوڑ دیا ہے بلکہ اسے قتل کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا صرف اتنا ہی حکم تھا جس کی تعمیل کی گئی، پھر دو قیمتی تھان اور تین سو اشرفی نذر کرتے ہوئے کہا یہ شاہ الموت کی طرف سے ہے اور یہ تنخواہ ہر سال ملتی رہے گی۔ اس کے بعد امام فخرالدین رازی نے ان کے خلاف عمر بھر کچھ نہ کہا۔ ایک مرتبہ ایک شاگرد نے اس بدلے ہوئے رویے کے بارے میں استفسار کیا تو کہا: ”ایشاں برھان قاطع دارند۔“

Scanned with CamScanner